باسمہ تعالیٰ

اشارات

کسے خبر تھی کہ جس خطہ پاک کو مال و جان، عزت و آبرو کی بے شمار قربانیوں کے عوض اسلام کے لیے تجربہ گاہ کے طور پر حاصل کیا گیا تھا وہ ایک نہایت ہی قلیل مدت میں فتنوں کی آماجگاہ بن جائے گا اور وہ سرزمین جس میں صرف اللہ کا حکم بلند ہونا تھا اس میں شیطنت کے تند و تیز طوفان اٹھیں گے۔ جس شخص نے پاکستان کی مختصر سی تاریخ کا ایک سرسری جائزہ لیا ہے وہ اس امر سے بخوبی واقف ہے کہ فتنوں کا ایک لامتناہی چکر ہے جس میں ہر وہ فرد اپنے آپ کو گرفتار پاتا ہے جو مسلمان کی حیثیت سے یہاں زندہ رہنا چاہتا ہے اور ایمان کی دولت کے ساتھ دفن ہونے کی آرزو رکھتا ہے۔ یہاں کا برسر اقتدار طبقہ ہر شر کی محض اس لیے پشت پناہی کر رہا ہے کہ کسی طرح اسلام پر عرصہ حیات تنگ ہو اور یہ دین اپنے گھر میں ہی اجنبی ہو کر رہ جائے۔ یہاں کفر و الحاد، فسق و فجور کو لوگوں پر مسلط کرنے کی مسلسل کوششیں کی جا رہی ہیں، یہاں صنفی بے راہ روی اور عیش و طرب کو فروغ دینے کے لیے سامان مہیا ہو رہے ہیں، یہاں خاندانی نظام پر، جو دراصل اسلامی اقدار کا مضبوط ترین حصار ہے ایک گہری سازش کے ساتھ تابڑ توڑ حملے کیے گئے۔ پھر اسی سرزمین میں نہ صرف قادیانیت کو پناہ حاصل ہوئی، بلکہ اسے شہ بھی ملی تاکہ وہ ملت اسلامیہ کے اندر انتشار پیدا کر سکے۔ یہاں فتنہ انکار حدیث کی پوری پوری سرپرستی کر کے اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ کسی طرح اس قوم کے دل و دماغ سے اپنے ماضی کی عظیم الشان روایات کو محو کیا جائے، تاکہ اس کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کے جہاز بے لنگر ہو کر بڑی آسانی کے ساتھ ان کے اٹھائے ہوئے طوفانوں کی نذر ہو جائیں۔ اس سلسلہ کا ایک شاہکار یہ بھی ہے کہ جس بنیاد پر یہ ملک تقسیم ہوا تھا اسی بنیاد کو ہی مخلوط انتخاب کے ذریعہ منہدم کر دیا گیا ہے۔ فتنوں کی اس لمبی فہرست میں اب ایک تازہ اضافہ

"ضبط ولادت" کے فتنہ سے ہوا ہے، جسے یار لوگوں نے اپنی روایتی ہوشیاری کے ساتھ عائلی منصوبہ بندی کے "مقدس" نام سے پیش کیا ہے۔

اس فتنے کو اٹھانے کا ٹکنیک بھی وہی پرانا ہے یعنی ایک مسئلہ جو ہمارے ملک کے لیے کوئی بنیادی اہمیت نہیں رکھتا مگر جس سے لوگوں کے ذہنوں میں اسلام کے متعلق شکوک وشبہات پیدا کیے جا سکتے ہیں اُسے بیٹھے بیٹھے محض ایک شوشہ کے طور پر چھوڑ دیا جاتا ہے پھر اس کی نشر و اشاعت کے لیے پوری سرکاری مشینری حرکت میں آجاتی ہے اور اس طرح اس کے گرد پراپیگنڈا کا طوفان اٹھا کر اپنے ناپاک عزائم کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔

بالکل اسی انداز سے ضبط تولید کے فتنہ کو بھی اٹھایا جا رہا ہے۔ یکایک لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات ڈالی گئی کہ ملک کی آبادی بڑی سرعت کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور ذرائع پیداوار محدود ہیں۔ اگر یہی صورت حال رہی تو یہاں کے رہنے والے شدید مصائب سے دوچار ہوں گے۔ پھر اس کا خود ہی یہ حل بھی تجویز فرما دیا کہ اس مصیبت سے بچنے کی اگر کوئی صورت ممکن ہے تو صرف یہی ہے کہ ضبط ولادت کے ذریعہ آبادی کو بڑھنے سے روک دیا جائے۔

یہ مسئلہ بظاہر بڑا نازک معلوم ہوتا ہے اور اس کے لیے جو حل پیش کیا گیا ہے وہ بھی سطح بین آنکھوں کو کافی معقول دکھائی دیتا ہے مگر وہ لوگ جن کے دل و دماغ جھوٹے پراپیگنڈا سے مأوف نہیں ہوتے اور جن کی نگاہیں سطحی اور وقتی مسائل میں الجھ کر نہیں رہ جاتیں بلکہ حقائق کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہیں وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس مسئلہ کو اٹھانے کا مقصد بھی اسلام کے خلاف زمین ہموار کرنا ہی ہے۔

آیئے اب ہم اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کریں اور دیکھیں کہ اس کی اصل حقیقت کیا ہے۔

جو انسان بھی اس دنیا میں جنم لیتا ہے اُسے کھانے کے لیے خوراک، تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا، سر چھپانے کے لیے مکان اور بیمار ہونے کی شکل میں علاج معالجہ کی ضرورت ہے۔ دنیا کا کوئی فرد بھی ایسا نہیں

جوان سے بے نیاز رہ سکے۔ اپنی ان روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وہ زندگی میں جدوجہد کرتا ہے اپنی جسمانی اور ذہنی قوتوں کو کام میں لاکر دولت کماتا ہے اور پھر اسے ان کے حاصل کرنے میں صرف کرتا ہے۔ حیات انسانی کی یہ احتیاجات درحقیقت وہ زبردست محرکات ہیں جو ایک فرد کے اندر سعی و عمل کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

عمر کی ایک خاص حد تک پہنچنے کے بعد جب انسان اپنے آپ کو رشتہ مناکحت میں باندھتا ہے تو پھر اُس کی ضروریات کا دائرہ بھی پھیلتا ہے۔ وہ اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے کہ اپنے لیے ان ضروریات کو مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ وہ انہیں اپنی رفیقۂ حیات کے لیے بھی فراہم کرے۔ اس جذبہ سے اُس کے اندر مزید محنت کی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد جب اس کے ہاں اولاد ہوتی ہے تو اُس کی جدوجہد اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔ بیوی بچوں کی محبت اُسے اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ اپنے ذاتی آرام و آسائش کو قربان کر کے اپنے گھر والوں کو ہر قسم کی سہولتیں مہیا کرے۔ خود دُکھ جھیل لے مگر کسی طرح انہیں سکھ پہنچائے یہ احساس نہ صرف انسانوں کو محنت و مشقت کی راہ پر لگاتا ہے بلکہ اُن کے اندر ایثار، وسعت قلبی، تحمل ضبطِ نفس ایسی بلند صفات بھی پیدا کرتا ہے۔ اب اگر کوئی مصلح قوم اس ملت کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ تم ضبط تولید کے ذریعہ اولاد کی افزائش کو روک دو تو وہ دراصل نہ صرف سعی و جدوجہد کے اس آخری محرک کو مٹاتا ہے جو اولاد کی محبت سے نوع انسانی کے سینے میں موجزن ہوتا ہے، بلکہ وہ انسانوں کے اندر ایک نہایت ہی ذلیل قسم کی خود غرضانہ ذہنیت بھی پیدا کرتا ہے، جو آگے چل کر اُس کے اندر اس احساس کو پرورش کرے گی کہ اُسے دنیا کے سارے فوائد و لذائذ خود اپنے لیے سمیٹ لینے چاہئیں اور دوسروں کو اس سے محروم کر دینا چاہیے۔

پھر اولاد کی محبت ایک ایسی مقناطیسی قوت ہے جو میاں اور بیوی کو باہم ایک دوسرے سے زندگی بھر جوڑے رکھتی ہے۔ شہوانی جذبہ جس میں ایک قسم کی خود غرضی پائی جاتی ہے، اُس میں یہ طاقت نہیں کہ ان دونوں کو تاحیات ایک دوسرے سے باندھ کر رکھے۔ نکاح کے بعد کچھ مدت تک تو یہ جذبہ بلاشبہ انہیں ایک دوسرے کے قریب رکھ سکتا ہے مگر یہ جلد ہی سرد پڑ جاتا ہے اور اس میں وہ جاذبیت باقی

نہیں رہتی کہ ان مائل بہ انتشار افراد کو ایک مسلک میں منسلک کر دے۔ اس وقت اولاد کی محبت ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جو انہیں منتشر نہیں ہونے دیتا۔ اس لیے جو لوگ اولاد کی ذمہ داریوں سے کتراتے ہیں اور انفرادی عیش و آسائش میں مشغول رہنا چاہتے ہیں وہ در اصل خاندانی نظام کے لیے ایک عظیم خطرہ ہیں یورپ میں جس رفتار سے ضبط تولید کا گمراہ کن نظریہ پھیلا بالکل اسی رفتار کے ساتھ وہاں طلاقوں کی تعداد بھی بڑھی اور خاندانی نظام بالکل تباہ ہو کر رہ گیا۔ اس صورت حال کی جو تصویر امریکہ کے ایک مشہور پروفیسر نے کھینچی ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"ہم کھانا اب ہوٹلوں میں اور رستوران میں کھاتے ہیں۔ ہماری روٹی بیکری سے آتی ہے۔ کپڑے لانڈری میں دھلتے ہیں۔ اگلے وقتوں میں تفریح کے لیے لوگ خاندانوں کی طرف رجوع کرتے تھے، لیکن اب اس کے لیے سنیماؤں، تھیٹروں اور کلبوں کا رخ کیا جاتا ہے۔ پہلے خاندان ہماری دلچسپی کا مرکز تھا اور خاندانی زندگی ہی میں سکون و آسائش تلاش کی جاتی تھی مگر اب خاندان کے افراد بکھر گئے ہیں۔ اور اگر کچھ مل کر بھی رہتے ہیں تو اُن کا مقصد فوت ہو گیا ہے۔ وہ دن کا زیادہ وقت اکیلے فکر معاش میں بسر کرتے ہیں۔ رات کا وقت جس میں کہ خاندان کے افراد اکٹھے ہوتے تھے وہ بھی اب علیحدگی میں گذرتا ہے۔ ہمارے گھر ہمارے لیے استراحت کی جگہ نہیں رہے جہاں ہم بہرحال شب باش ہوں۔ شب باشی کا تو ذکر ہی کیا اب تو ایک پوری رات بھی لوگ اپنے گھروں میں بسر کرنا پسند نہیں کرتے"

یہ تصورِ کائنات اور اس کے خالق کے بارے میں بھی ایک نہایت ہی گمراہ کن نظریہ کی آبیاری کرتا ہے انسان کے ذہن میں یہ خیال آہستہ آہستہ جڑ پکڑنے لگتا ہے کہ قدرت معاذ اللہ بڑی بخیل اور بے رحم ہے وہ ہر ذی روح کے ساتھ ایک شرمناک کھیل کھیلتی ہے۔ اس نے ایک ایسی زمین پر نسلوں کے پیدا ہونے اور بڑھنے کا سامان کر دیا ہے جس میں ان نسلوں کو پالنے کے لیے کافی سامان نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آبادی کو رزق کے ساتھ ساتھ رکھنے کے لیے قحط اور بیماریاں پھوٹ پڑتی ہیں۔ جنگ و جدال اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوتا ہے۔ قدرت کے لیے رحم دیوتا "دور کھڑے انسانوں کی اس تباہی و بربادی کا

تماشہ بڑے فرحت و انبساط سے دیکھتے ہیں۔ یہ نقطہ نظر انسانوں کے دل و دماغ میں خالق کائنات کے خلاف ایک نہایت ہی خوفناک بغاوت کی تخم ریزی کرتا ہے اور خدا کی خدائی میں انسان کے مستقبل کو سراسر تاریک دکھاتا ہے۔

یورپ کی پچھلی چند سالوں کی تاریخ اس بات پر ایک زندہ شہادت ہے کہ قدرت کے خزانے بیحد و حساب ہیں، کوئی شخص بھی کسی منزل پر بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ فطرت نے اپنی بخشش سے ہاتھ روک لیا ہے جو فرد بھی اس قسم کا دعویٰ کرتا ہے وہ دراصل حقیقت کا منہ چڑاتا ہے۔ قدرت نے بلاشبہ اپنے خزائن کو تقسیم کرنے کا انتظام کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ انسان کے اندر ان کی طلب کے ساتھ سعی کا جذبہ بھی پیدا ہو، مگر اس نے اپنے دروازے کبھی ان لوگوں پر بند نہیں کئے جنھوں نے انہیں کھٹکھٹانے کی ہمت کی۔

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے، ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

یورپ ۔ خصوصاً مغربی اور وسطی یورپ میں گذشتہ صدی سے آبادی حیرت انگیز رفتار کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ مگر اسی نسبت سے وہاں طریق پیدائش کی نئی نئی گرہیں بھی کھلیں۔ لوگوں نے زمین کے سینے کو چاک کر کے اناج کی اس قدر زیادہ مقدار حاصل کی کہ آج سے کچھ عرصہ پیشتر اس کا کبھی وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ کیا انگلستان کا معیار زندگی آبادی میں معتدبہ اضافہ کے باوجود گر گیا ہے۔ کیا آج امریکہ اور روس میں خوراک کی کمی ہے؟ کیا چین نے اپنی بلند ہمتی، محنت اور جفاکشی سے مالتھس کے نظریہ آبادی کو باطل نہیں کر دیا۔

جن ماہرین نے پاکستان کا ارضیاتی جائزہ لیا ہے ان کا خیال ہے کہ قدرت نے اس ملک کے رہنے والوں کے ساتھ بڑی فیاضی کا سلوک کیا ہے۔ قدرت کے یہ انمول عطیات زمین کی سلوٹوں میں منہ چھپائے اس بات کے سراپا منتظر ہیں کہ کوئی تیز اور متجسس نگاہ سطح زمین کے خارجی پردوں کو چیرتی ہوئی ان تک پہنچے اور انہیں معلوم کرے اور پھر کوئی متحرک ہاتھ انہیں وہاں سے نکال کر استعمال میں لائے۔ پاکستان کی اصل ضرورت اس وقت قدرت کے ان چھپے ہوئے عطیات کو معلوم کرنا اور ان سے استفادہ کرنا ہے۔ مگر

ہمارے یہ بہی خواہ ہمیں اس وقت کم ہمتی کا مشورہ دیتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں کہ تم پیداوار اور وسائل زندگی میں اضافہ کرنے کی بجائے، اولاد میں کمی کردو تاکہ جو کچھ اس وقت ذرائع ہیں وہی آبادی کے لیے کافی ہوسکیں۔ اس سلسلہ میں قرآن حکیم کا صاف ارشاد ہے :

ولا تقتلوا اولادکم من املاق نحن نرزقکم وایاھم (الانعام رکوع ۱۸)

اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر کی وجہ سے نہ قتل کرو۔ ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی۔

اس نظریہ نے انسان کے متعلق بھی ایک نہایت گھٹیا تصور پیش کیا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کی حیثیت اس کارخانہ حیات میں ایک عارضی و اتفاقی شئے کی سی ہے جو فطرت کی اندھی قوتوں کی نہ صرف تخلیق ہے بلکہ اُن کے ہاتھ میں ایک بے بس کھلونا بھی ہے اُسے اس مادی دنیا میں تصرف کا کوئی اختیار نہیں وہ اس بات پر مجبور ہے کہ مادی دنیا کے وسیع اور پیچیدہ طلسم میں جو غیر محدود زمان و مکان میں پھیلا ہوا ہے ایک مبہوت حیوان کی سی زندگی بسر کرے اور فطرت کی ان کرشمہ سازیوں کا ایک خاموش اور غیر متعلق تماشائی بن کر رہے۔

مارکس کا تصور سائنس کے جن نظریات پر مبنی ہے وہی اب بدل چکے ہیں۔ اب مادہ کا سکون آفریں تصور قابل قبول نہیں رہا۔ اس دنیا کو اب چند طبیعی قوتوں کا ایک کھیل تسلیم نہیں کیا جاتا۔ آگہی اور وقوف سے نوازے جانے کے بعد، انسان کی آزادی کی ابتدا ہوئی اور اس دور کا خاتمہ ہوا جب وہ مجبور محض تھا۔ اب انسان زمان و مکان کے تقیدات کا پابند نہیں بلکہ دور آفاق اپنی رفتار کے پیچ و خم کو اس کے اشارۂ ابرو کے مطابق معین کرتا ہے، مادی اسباب وسائل کی کمی اُس کے عزائم کو کمزور اور اس کے ارادوں کو پست نہیں کرسکتی بلکہ یہ اُسے اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ وہ فکر و شعور کی قوتوں سے مسلح ہوکر متصادم ہو، اور اسی طرح اپنی توسیع و بقا کا سامان مہیا کرے۔

اس تصور کا ایک اور افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس میں یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ ہر وہ انسان جو اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے وہ سوسائٹی پر محض ایک بوجھ ہے۔ آپ خود غور کریں جب انسان کو صرف ایک بوجھ کی حیثیت سے

دیکھا جائے تو اُس کے متعلق کس قسم کے جذبات پیدا ہوں گے اور کس قسم کے احساسات پرورش پائیں گے۔ جو لوگ انسان کے متعلق اس خیال کو پھیلا رہے ہیں وہ غالباً اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ آدم کا جو بیٹا ایک پیٹ لے کر پیدا ہوتا ہے وہ اپنے ساتھ کام کرنے کے لیے دو ہاتھ دو پاؤں اور سوچنے سمجھنے کے لیے دل و دماغ کی بے شمار صلاحیتیں بھی لاتا ہے۔ اس نظریہ میں اس خیال کو بڑی شدت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ ایک فرد جو کچھ سماج سے لیتا ہے وہ اُس سے کہیں زیادہ ہے جو کچھ کہ وہ اُسے دیتا ہے یا دے سکتا ہے۔ بد دیانتی اور بے انصافی کی اس سے زیادہ اور کون سی مثال ہو سکتی ہے۔

ضبط ولادت کے نظریہ کو جن حالات نے جنم دیا انہیں بھی یہاں سمجھ لینا بے حد ضروری ہے۔ یورپ نے جب بھاپ کے دیو کو مسخر کر کے اُس سے کام لینا شروع کیا تو اس سے یورپ کا پورا نظام معیشت و معاشرت تہ و بالا ہوا۔ چونکہ اس سارے ڈرامہ کا ہیرو سرمایہ تھا اس لیے اُسے سماج میں ایک غیر معمولی اہمیت حاصل ہونے لگی۔ وہ دیکھتے دیکھتے لوگوں کا معبود بن گیا۔ پھر قوت و اقتدار دونوں خود بخود اُس کے قدموں میں آگرے۔ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُس نے ایسے ایسے نظریات گھڑے جن سے اُس کی پوزیشن بالکل مضبوط ہو جائے۔

یہی وہ وقت تھا جب محنت کشوں پر مصائب کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔ کارخانہ دار پیداوار کا اکثر حصہ خود ہتھیا لیتا اور ان غریبوں کو قوت لایموت بھی میسر نہ آتی۔ وہ نہایت ہی حسرت بھری نگاہوں سے یہ دیکھ رہے تھے کہ قوم کے چند خوش نصیب لوگ دن بدن امیر سے امیر تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ مگر اُن میں اب یہ سکت بھی باقی نہیں رہی کہ وہ جسم و روح کے تعلقات کو قائم رکھ سکیں۔ اس نازک صورت حالات نے انہیں سوچنے پر مجبور کیا۔ سرمایہ داروں کو جب یہ خطرہ ہوا کہ کہیں اُن کے سوچ و بچار کی زد ہم پر نہ پڑے تو انھوں نے کمال عیاری سے لوگوں کے کان میں یہ بات پھونک دی کہ اس غربت و افلاس کی ذمہ داری یا تو خود اُن پر عائد ہوتی ہے یا فطرت پر۔ اور اس معاملہ میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ لوگ

(باقی صفحہ ۶۲ پر)